ذوقؔ کی شاعری اور مسائلِ حیات

فاروق اعظم قاسمی

شعبۂ اُردو، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

انیسویں صدی کے استاد الشعرا شیخ ابراہیم ذوقؔ دہلوی کا نام اردو ادب میں کئی حوالوں سے اہمیت کا حامل ہے۔ وہ مغل ہندوستان کے دہلوی تہذیب کے پاسدار و ترجمان تھے۔ ذوقؔ نے اپنے علم و فن کے ذریعے بھی اس سرمایے کی حفاظت کی اور عملی طور پر بھی پوری زندگی اسی خاک سے چمٹے رہے۔

ذوقؔ کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا، لیکن اللہ کے دیے سے ان کا دامن مختلف علوم و فنون سے مالا مال تھا۔ کم عمری ہی میں شاعری شروع کر دی تھی۔ کمالِ ہنر کا یہ عالم کہ چند روز ہی میں استاد کو پیچھے چھوڑا۔ صرف ۱۹ سال کی عمر میں قلعۂ معلّٰی تک رسائی حاصل کر لی اور اسی عمر میں اکبر شاہ ثانی نے ''خاقانیِ ہند'' جیسے باوقار خطاب سے نوازا اور ساتھ ہی ولی عہد بہادر شاہ ظفرؔ کے استاد بھی ٹھہرے حالاں کہ استاد شاگرد سے چودہ سال چھوٹے تھے۔ ان دونوں کے درمیان نقطۂ امتیاز یہ ہے کہ ایک پستی سے بلندی کی طرف جا رہا ہے اور دوسرا عروج سے زوال کی سمت ڈھلک رہا ہے۔ بادشاہ بے چارہ تو بادشاہ نہ رہا، لیکن اس نے ذوق کو ''ملک الشعرا'' ضرور بنا دیا۔

ان اعزازات کے باوجود ذوقؔ کی طبیعت میں حد سے زیادہ سادگی اور انکساری تھی۔ سادگی اور نام و نمود سے دوری کا یہ عالم تھا کہ تادمِ واپسیں اپنے دیوان کے جمع و ترتیب کی جانب متوجہ نہ ہوئے بلکہ جب کسی عزیز و شاگرد نے اس امر کی طرف توجہ مبذول کرائی تو بڑی خوب صورتی اسے ٹال گئے:

ذوقؔ کیوں کر ہو اپنا دیواں جمع
کہ نہیں خاطرِ پریشاں جمع
ذوقؔ دلِ سوختہ دیواں لکھے اپنا کیا خاک
متحمل نہیں گرمیٔ سخن کا کاغذ

اس سلسلے میں ذوقؔ کی بے توجہی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنے بہت سے اشعار اپنے شاگردوں کو ہدیہ کر دیا کرتے تھے۔ ذوقؔ کی اس دریا دلی کے باعث ان کے کئی شاگرد صاحبِ دیوان ہو گئے تھے اور استاد ان کی حوصلہ شکنی نہیں چاہتے تھے۔ تنویر احمد علوی نے مرزا قادر بخش کے حوالے سے لکھا ہے: ''اکثر احبابِ صداقت کیش و تلامذۂ اخلاص اندیش ان کے اشعارِ گوہر نثار سے بڑی بڑی بیاضیں فراہم رکھتے تھے''۔ (۱) نواب عبدالغفور نے سیر المتشم میں لکھا ہے کہ ذوقؔ اگر اپنا دیوان جمع کرتے تو سو جلد سے کم نہ ہوتے۔ (۲) انکساری اور تواضع کا یہ حال تھا کہ نہ کبھی اپنی شاعری کو کسی کے طعن و تشنیع سے آلودہ کیا اور نہ کسی اور کو ہجو و ہفوات کا موقع دیا۔ ذوقؔ کے شاگردِ رشید مولانا محمد حسین آزاد فرماتے ہیں: ''خدا نے کمالِ شاعری اور ایسا اعلیٰ درجہ قادر الکلامی کا دیا اور چند آدمیوں سے انھیں ناراضی یا رنج بھی پہنچا، مگر تمام عمر میں ایک شعر بھی ہجو میں نہ کہا... اکثر کہا کرتے تھے کہ زبان جوہرِ لطیف ہے، اسے بدی سے آلودہ نہ کرنا چاہیے''۔ (۳)

ذوقؔ نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی مثلاً غزل، قصیدہ، مثنوی، واسوخت، قطعہ اور رباعی وغیرہ۔ جیسا کہ دہلی اردو اخبار کے حوالے سے مولانا آزاد لکھتے ہیں: ''اس صاحبِ کمال کو جملہ اصنافِ سخن پر مثل قصیدۂ و غزل، قطعۂ و مثلث، رباعیٔ و مخمس، مسدس و مثنوی، واسوخت و نظم و تاریخ وغیرہ اقسام ہیجدہ گانہ شعر پر قدرتِ کلی حاصل تھی بلکہ علاوہ بریں ٹپہ، ٹھمری، کبت و چار بیت، گیت و سنگیت و دوہرا کسی نظم میں عاری نہ پایا''۔ (۴) ذوق نے خوب صورت غزلیں اور پر شکوہ قصیدے بھی کہے لیکن کلام کا بیشتر حصہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی نذر ہو گیا تاہم موجودہ شعری سرمایے میں بھی غزل قصیدے پر حاوی ہے۔ اس کے باوجود نہ معلوم ذوق کا نام سنتے ہی ایک قصیدہ گو شاعر ہی کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔

اس وقت مجھے اپنے اس مقالے میں ذوقؔ کے اس سرمایۂ کلام کا جائزہ لینا مطلوب ہے جس میں استاد ذوق نے زندگی کے عام مسائل کو بڑی خوب صورتی سے برتا ہے۔ کہیں اخلاقیات کے رنگ میں تو کہیں

تصوف کے آہنگ میں۔ انیسویں صدی کے اس عظیم شعری منظر نامے کو جب ہم اکیسویں صدی کے جھروکے سے دیکھتے ہیں تو سارے مناظر آج ہی کے محسوس ہوتے ہیں۔ کردار کے نام ضرور بدل گئے ہیں تاہم سارے کرتب من وعن وہی ہیں۔ زبان پر پہرا، ذہن ودماغ پر پہرا، سیاہ کو سفید نہ کہنے پر دار ورسن اور جو جتنا بڑا چور وہ اتنا ہی بڑا سینہ زور۔ پہلے لٹیرے من کے کالے تن کے گورے ہوا کرتے تھے اور اب اتنا فرق ہوا ہے کہ دونوں پر سیاہی چھائی ہوئی ہے:

ہے اپنے سینے میں وہ آہِ آتشیں اے ذوقؔ
کہ برق دیکھے تو فی النارِ والسقر ہو جائے
ہم آپ جل بجھے مگر اس دل کی آگ کو
سینے میں ہم نے ذوق نہ پایا بجھا ہوا
دل میں ہے جوشِ مضامین تو نہایت لیکن
دل حوادث سے زمانے کے ہے بے تاب وتواں

ایک عظیم شاعر زبان کی شاعری کے بجائے دل کی شاعری کرتا ہے جو دل سے نکل کر دل میں اتر جاتی ہے۔ مولانا آزاد کے بقول: ''ان کے لفظوں کی ترکیب میں ایک خداداد چستی ہے، جو کلام میں زور پیدا کرتی ہے، وہ زور فقط ان کے دل کا جوش ہی نہیں ظاہر کرتا بلکہ سننے والے کے دل میں ایک خروش پیدا کرتا ہے''۔(۵)

اگر ہم غور کریں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ذوق کے یہاں فن موضوع پر حاوی ہے کیوں کہ اس ماحول کا مزاج بھی کچھ اسی طرح کا تھا یہی وجہ ہے کہ انھوں نے زبان و بیان اور الفاظ وتراکیب پر زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ اس سلسلے میں جمیل جالبی کا خیال ہے: ''زبان کی شاعری، محاورات اور کہاوتوں کا استعمال اس تہذیب کی گھٹی میں پڑا تھا... محاورات اور صنائع و بدائع سے شعر میں رنگینی پیدا کرنا اس دور کی شاعری کا مزاج تھا۔ ذوق نے یہی کیا اور سب سے بہتر کیا۔ اسی لیے ان کے بے شمار شعر ضرب المثل بن کر عوام وخواص کی زبان پر چڑھ گئے اور دورانِ گفتگو بیان کا حصہ بن گئے''۔(۶) دہلوی زبان کے رچاؤ اور محاورات کے برمحل استعمال کا نمونہ ان اشعار میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے کہ کس طرح اشعار گفتگو کا حصہ بن جاتے ہیں:

پھرتے ہیں لکھے پڑھے سودے میں مال و جاہ کے
طفلِ مکتب رہتے ہیں گنبد میں بسم اللہ کے
اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونقِ چمن
اے ذوقؔ اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے
ہے قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا
خوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیاد کا
کھل کے گل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

ذوق کے کلیات کا آپ مطالعہ کر ڈالیں بمشکل ہی دو چار فی صد اشعار ایسے ملیں گے جن کی لفظیات ذرا نامانوس یا متروک ہوگئی ہیں ورنہ تو سادگی اور سہل پسندی ذوق کا شعری امتیاز ہے بلکہ انھوں نے اپنے کلام میں جو علائم ورموز استعمال کیے ہیں وہ بھی سادہ، سہل اور عام فہم ہیں۔ جمیل جالبی لکھتے ہیں: ''ذوق نے جو علائم ورموز اپنی شاعری میں استعمال کیے ہیں خواص تو خواص تھے، عوام بھی ان سے واقف تھے''۔(۷)

ذوق کو چوں کہ مجددِ وقت اور محدثِ دوراں شاہ عبد العزیزؒ کی شاگردی کا بھی شرف حاصل ہے اس لیے ان کے موضوعاتی کینوس کے محدود ہونے کے باوجود مذہب، تصوف اور اخلاقیات کی خوشبو ان کے کلام میں رچی بسی ہوئی ہے۔ تصوف کے تناظر میں جب ہم کلامِ ذوق کا مطالعہ کرتے ہیں تو قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ کے معانی ومفاہیم سے ہم دوبدو ہوتے ہیں کہ انسان کا کھلا دشمن شیطان ہے اور اس سے بھی بڑا دشمن خود انسان کا نفس ہے۔ جس نے اس پر قابو پالیا گویا اس نے نصف اقلیم فتح کرلیا۔ ذوق نے یہاں اپنے گناہوں کے اظہار میں رعایتِ لفظی سے کام لیا ہے۔ اسی کا ساتھ ذوق کے صوفیانہ اشعار میں گناہوں پر پشیمانی، ندامت کے آنسو میں سرخروئی کا پیغام بھی ملتا ہے۔ حق کی تلاش میں بندہ جنگلوں اور پہاڑوں کی خاک چھانتا ہے، لیکن آخر کار وہ اس کے پہلو ہی میں چھپا ملتا ہے۔ اب ان رنگوں کو ذیل کے اشعار میں ملاحظہ فرمائیں:

بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا
گیا شیطان مارا، ایک سجدے کے نہ کرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا
گر چہ ہے استاد شیطاں، نفس شاگردِ رشید
پر یہ شاگردِ رشید استاد ہے استاد کا
اگر آتش مزاجوں کو حسد ہو خاکساروں سے
تعجب کیا کہ ابلیسِ لعیں دشمن ہے آدم کا

ذوق عملی دنیا میں بھی دیگر معاصر شعرا سے قدرے منفرد تھے۔ ان کے مزاج کی درویشی، صبر وقناعت اور اخلاص ومحبت جیسے اوصاف انھیں امتیاز بخشتے ہیں۔ ایسے ہی دنیا سے بے ثباتی بھی ان کے کلام سے مترشح ہیں۔ نمونے کے چند اشعار پیش ہیں:

سراپا پاک ہیں دھوئے جنھوں نے ہاتھ دنیا سے
نہیں حاجت کہ وہ پانی بہائیں سر سے پاؤں تک
وہ دولت کر طلب جس سے کہ دل ہوجائے مستغنی
اگر ہاتھ آئے گا گنجینۂ قاروں نہ ٹھہرے گا

تصوف کے ضمن میں ذکرِ موت اور فکرِ آخرت کو بھی بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ چوں کہ وصل حبیب اصل میں عشق کی انتہا ہے اور عاشق کو اس عروج پر پہنچنے کے لیے موت کا دروازہ کھٹکھٹائے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اب موت سے ہم رشتہ اشعار مندرجۂ ذیل ہیں:

یہ اقامت ہمیں پیغامِ سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے
لائی حیات آئی قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ایک بڑے ادیب یا ایک عظیم شاعر کے اندر انسانیت نہ ہو تو وہ عظیم تو کجا، شاعر وادیب ہی کہلانے کا کیوں کر مستحق ہوسکتا ہے؟ شاعر کو تو خلیفۂ پیمبر کہا گیا ہے اس لیے کہ اللہ نے اسے زبان وبیان جیسی بیش بہا دولت سے نوازا ہے۔ یہی وجہ کہ حضرتِ موسیٰؑ نے اشاعت حق کی مہم میں اللہ سے اپنے بھائی حضرتِ ہارونؑ کے ذریعے مدد چاہی۔ قرآن نے مدد کی نوعیت کو بڑے واضح انداز میں بیان کیا ہے: ''اخی ھارون ہو افصح منی لساناً'' (۸) یعنی مدد سے مراد زبان کی فصاحت ہے۔ جب یہ واضح ہوگیا کہ شاعر کو بھی پیمبرانہ وراثت کا کچھ حصہ دیا گیا ہے تو اب اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ انسانیت کی بات کرے، حق کی بات کرے، انصاف کی بات کرے، انسانی برابری کی بات کرے، سماج کو جوڑنے کی بات کرے، ترقی بات کرے اور محبت کی خوشبو پھیلائے۔ اخلاقیات کے یہی رنگ ان اشعار میں دیکھیں:

آدمیت اور شئی ہے علم ہے کچھ اور چیز
کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا
نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا
خورشید وار چرخ پہ چمکا کوئی تو کیا
آخر کو پھر جو دیکھا تو زیرِ زمیں گیا
کتنے مفلس ہو گئے کتنے تونگر ہو گئے
خاک میں جب مل گئے دونوں برابر ہو گئے

ذوق معاشرت اور عام مسائلِ حیات کو بھی بڑے فنکارانہ اسلوب میں پروتے ہیں۔ پروفیسر سید احتشام حسین کے مطابق: ''وہ مانے ہوئے استاد تھے، زبان پر ان کو بڑی قدرت حاصل تھی، زندگی کے عام مسائل کو عمومی اخلاقی شکل دے کر پیش کرتے تھے''۔ (۹) ملاحظے کے لیے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں:

اے ذوقؔ تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام میں ہے وہ جو تکلف نہیں کرتا
بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

حبِ وطن دراصل حبِ انسانیت ہے۔ انسان سب سے پہلے اپنی چھوٹی سلطنت یعنی اپنے ماں باپ، بھائی بہن اور بیوی بچوں سے محبت کرتا ہے اور یہ عین انسانیت ہے۔ پھر یہی سلسلہ محلے، بستی، شہر، ملک اور پوری انسانی دنیا تک پہنچ جاتا ہے۔ اب جسے چھوٹی سلطنت سے محبت نہ ہو تو وہ بڑی سلطنت سے کیسے پیار کر سکتے ہیں؟ اس لیے اپنی جڑوں سے پیار اور اپنی زمین ووطن سے محبت انسانی فطرت کا بھی حصہ ہے اور ایمان کا بھی۔ ذیل کے اشعار میں ذوق کا وطن کی مٹی سے پیار دیکھیے اور کس اچھوتے اور البیلے انداز میں اپنے جذبے کا اظہار فرماتے ہیں سنیے اور سر دھنیے:

فراقِ خلد سے گندم ہے سینا چاک اب تک
الٰہی ہو نہ وطن سے کوئی غریب جدا
گندم ہے سینا چاک فراقِ بہشت میں
آدم کو کیا نہ ہوگی محبت وطن کے ساتھ
ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن
کون جائے ذوقؔ! دلی کی گلیاں چھوڑ کر
وہ دل کہ جس میں سوزِ محبت نہ ہووے ذوقؔ
بہتر ہے اس سے سنگ کہ اس میں شرر تو ہے

افسوس! آج اسی ذوقِ محبِ وطن کے فرزندوں اور سپوتوں سے حبِ وطن کی سند مانگی جارہی ہے۔ موجودہ حالات وحوادث کے پیشِ نظر کچھ

اشعار میں ذوق کا تیور تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ گویا وہ جے این یو کی زبان بول رہے ہیں:

ہمیشہ کام مجنوں کو رہا صحرا نوردی سے
بسایا خانۂ زنجیر ہم نے پائے مردی سے
کل جہاں سے کہ اٹھا لائے تھے احباب مجھے
لے چلا آج وہیں پھر دلِ بے تاب مجھے

اب ذوق حاکمِ وقت سے مخاطب ہو کر اسے للکار رہے ہیں کہ تم نے تو بڑے بڑے دعوے کیے اور کر رہے ہو، تم نے ہر مرض کے علاج کا بھی وعدہ کیا تھا، لیکن تمھارے اختیار کردہ تریاق سے کتنے بیمار صحت یاب ہوئے؟ اور متعین وقت تک بیمار کا علاج نہیں ہوا تو پھر تمھارا علاج کیا ہونا چاہیے؟ یہ سوال انیسویں صدی کا ہے جس کا جواب دینا اب بھی باقی ہے:

بیمارِ عشق کا جو نہ تجھ سے ہوا علاج
کہہ اے طبیب تو ہی کہ پھر تیرا کیا علاج

انسانی زندگی کے تجربات و مشاہدات ہی اصل میں کلامِ ذوق کے موضوعات ہیں۔ زبان و بیان کی روانی، صفائی، برجستگی اور شیرینی ان کا امتیاز ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد فرماتے ہیں: ''غزلوں کے دیوان کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ عام جوہران کے کلام کا تازگیٔ مضمون، صفائیٔ کلام، چستیٔ ترکیب، خوبیٔ محاورہ اور عام فہمی ہے''۔(۱۰) ذوق کے اشعار کی اہمیت کل بھی تھی، آج بھی اور آئندہ کل بھی رہے گی جیسا کہ شاعر کا یقین ہے کہ

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوقؔ
اولاد سے رہے یہی دو پشت چار پشت

آخر میں ذوق ہی کے ایک شعر پر مضمون کو تمام کیا جاتا ہے جسے مولانا آزاد کے مطابق ذوق نے اپنی وفات سے تین گھنٹے قبل کہا تھا:

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

حواشی:

(۱) کلیاتِ ذوقؔ، مرتب: تنویر احمد علوی، ترقی اردو بیورو نئی دہلی (۱۹۸۹ء) دوسرا ایڈیشن، ص:۳۵
(۲) کلیاتِ ذوقؔ جلد نمبر:۱، مرتب: تنویر احمد علوی، مجلس ترقیٔ ادب اردو لاہور (۱۹۶۷ء) ص:۱۱
(۳) دیوانِ ذوقؔ، مؤلف: مولانا محمد حسین آزاد، محبوب المطابع دہلی، (۱۹۳۲ء) ص:۳۰
(۴) کلیاتِ ذوقؔ جلد نمبر:۱، مرتب: تنویر احمد علوی، مجلسِ ترقیٔ ادب لاہور (۱۹۶۷ء) ص:۸
(۵) دیوانِ ذوقؔ، مؤلف: مولانا محمد حسین آزاد، محبوب المطابع دہلی، (۱۹۳۲ء) ص:۳۲
(۶) تاریخِ ادبِ اردو، جلدِ چہارم، حصۂ اول، جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، (۲۰۱۳ء) ص:۲۵۳
(۷) تاریخِ ادبِ اردو، جلدِ چہارم، حصۂ اول، جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، (۲۰۱۳ء) ص:۲۵۲
(۸) سورۂ قصص، آیت:۳۴
(۹) اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، سید احتشام حسین، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نئی دہلی، (۲۰۰۹ء) ساتواں ایڈیشن، ص:۱۲۷
(۱۰) دیوانِ ذوقؔ، مؤلف: مولانا محمد حسین آزاد، محبوب المطابع دہلی، (۱۹۳۲ء) ص:۲۸

○○

اردو صحافت کا ارتقا

اردو صحافت نے ارتقاء کا عمل کن مراحل سے گزر کر پورا کیا ہے اور اس کے صحافیوں نے اپنی جفاکشی، محنت اور جدوجہد سے تاریخ کے صفحات پر جو نقوش ثبت کیے ہیں یہ کتاب دراصل اسی کا ایک مبسوط خاکہ ہے جس میں دو صدیوں پر محیط اردو صحافت کے تاریخی، فنّی اور تکنیکی ارتقاء کی تاریخ کو سمیٹا گیا ہے۔ کتاب میں اردو صحافت کو درپیش مسائل پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

مصنف: معصوم مرادآبادی صفحات: ۲۲۴، قیمت: ۱۵۰/روپے

ناشر: اردو اکادمی، دہلی